بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

مقدمہ

عمل کا زوال اگر زیادہ عرصہ تک باقی رہے تو وہ صرف عمل ہی کا زوال نہیں رہتا، بلکہ پہلے جذبات واحساسات کا، اور پھر افکار وتصورات کا بھی زوال بن جاتا ہے۔ جب کوئی قوم یا ملت اپنی اصل حیثیت زندگی کے میدان میں کھو بیٹھتی ہے تو وہ اسے اپنے ذہن میں بھی زیادہ دنوں تک ٹھیک ٹھیک محفوظ نہیں رکھ سکتی اور اس پر خود ناشناسی کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ وہ بھولنے لگتی ہے کہ اس زمین پر اس کا وجود کس غرض کے لیے ہے اور اس غرض کو پورا کرنے کے لیے اسے کون سا طرز فکر اور طریق کار اپنانا چاہیے؟

ملت اسلامیہ پر ایک مدت سے یہی نفسیاتی عمل طاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین کو قائم کرنا، اور قائم رکھنا، ساری دنیا کے لیے حق کا شاہد اور نگراں بننا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا، اور خیر کامل کی طرف لوگوں کو بلاتے رہنا، اس کی منصبی ذمہ داری تھی۔ یہی اس کے وجود کی کل غایت تھی اور یہی اس کی اصل حیثیت تھی۔ اس نے ایک وقت تک اس ذمہ داری کو اس طرح انجام دیا جس طرح انجام دینے کا حق تھا، اور صرف اسی نے نہیں، بلکہ دوسروں نے بھی سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اس ملت کی غایت وجود اور اس کی اصل حیثیت یہ ہے۔ پھر اس کی غفلتوں نے اس کی زندگی کی بساط اُلٹ دی اور اسے اپنی اس حیثیت سے عملاً محروم کر کے رکھ دیا۔ اس محرومی نے فطری طور پر مزید محرومیوں کو جنم دینا شروع کر دیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ اسے اپنا مقصدِ وجود، اپنے اصولِ حیات اور اپنے دینی تصورات، لفظوں کی حد تک تو ضرور یاد رہ گئے ہیں مگر یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کے معانی بھی صحیح طور پر اسے یاد رہ گئے ہیں۔ اور اگر یہ بھی باور کر لیا جائے، تو کم از کم یہ تو کسی حال میں بھی نہیں مانا جا سکتا کہ جذباتی اور فکری طور پر بھی اس کے

اندراان کی اہمیت کا احساس باقی رہ گیا ہے۔

انھی اصولِ حیات اور دینی تصورات میں سے ایک اہم ترین چیز اس کے اجتماعی کردار اور اس کی اپنی مخصوص تنظیم کا مسئلہ بھی ہے۔ جو بظاہر ایک مسئلہ ہے، لیکن فی الواقع متعدد مسائل کا جامع ہے، اور غلط نہ ہوگا اگر اسے ملت اسلامیہ کی شہ رگ سمجھا جائے۔ اتنے اہم مسئلہ کی حقیقت سے، اس کی اہمیت سے، اور اس کے عملی مطالبات سے عام دل و دماغ افسوس ناک حد تک بے گانہ ہو چکے ہیں۔ اس بے گانگی کا حال یہ ہے کہ آج ملت کے چارہ سازوں کا ایک گروہ تو اس کے تصور ہی سے پریشان ہو اٹھتا ہے، اور دین کے اجتماعی کردار اور ملت کی تنظیم کو زمانہ کا سب سے بڑا کفر سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک لوگ ہر کام کے لیے اکٹھے ہو سکتے ہیں، ہر مقصد تنظیم کی بنیاد بن سکتا ہے، ہر مشن اور ازم، کی خاطر گروہ سازی کی جا سکتی ہے، لیکن مسلمان بحیثیت مسلمان، اور اسلام کی خاطر ہرگز منظّم نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لوگ اگر چہ اس طرح نہیں سوچتے، اور وہ مسلمانوں کے متحد ہو جانے کو اپنی محبوب ترین تمنا سمجھتے ہیں، لیکن مسلمان متحد و منظّم کس لیے ہوں؟ کس طرح ہوں؟ کن بنیادوں پر ہوں؟ اور اگر نہ ہوں تو اس کا حقیقی نقصان کیا ہے؟ یہ جاننے اور بتانے والے ان میں سے بھی بہت کم ملیں گے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کہنے والے جو کچھ کہتے سنے جاتے ہیں، اس سے بسا اوقات ''کلمةُ حَقٍ اُرِیْدَ بِھَا البَاطِلُ '' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ نام تو ملتِ اسلامیہ کی تنظیم کا لیا جاتا ہے، مگر اس کا مفہوم، اس کی غایت، اس کا طریقہ، سب کا سب عموماً وہ ہوتا ہے جو اسلامی سے زیادہ غیر اسلامی ہوتا ہے۔ مسلمان جس مرکز پر، اور جس طرح بھی متحد ہو جائیں، وہ ان کے نزدیک ''اسلامی اتحاد'' اور ''ملی تنظیم'' ہے۔ حالانکہ اسلام نے مسلمانوں کو صرف اللہ کی کتاب پر اور اس کے رسولؐ کی سنت کے مطابق ہی منظّم ہونے کی تلقین کر رکھی ہے۔ مسلمانوں کی ہر اجتماعی ہیئت ان کی نظر میں اسلام کی متاعِ مطلوب ہے، حالانکہ اس کو صرف ''جماعت'' نہیں، بلکہ ''الجماعۃ'' مطلوب ہے، اور ''الجماعۃ'' کا مفہوم بقول علامہ رشید رضا مصری، ''زمانۂ نبوت میں مسلمانوں کی ایسی ہیئت اجتماعی سے تھا جو کتاب و سنت کے احکام کو زیرِ عمل لا کر دین کو قائم رکھے۔''

(تفسیر المنار جلد ۶ صفحہ ۳۶۷)

اس صورت حال کا شدید مطالبہ تھا کہ اس اہم ترین مسئلہ کے تمام ضروری پہلو کتاب وسنت کی روشنی میں بالکل واضح کر دیے جائیں۔ تاکہ جب ملی اتحاد و تنظیم کی باتیں کی جائیں اور کوششیں انجام دی جائیں، تو معاملہ کی حقیقی نوعیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، اور یہ اچھی طرح معلوم رہے کہ اسلام نے جس اجتماعیت اور تنظیم کا حکم دیا ہے وہ فی الواقع ہے کیا؟ وہ دین وملت کو کس حد تک مطلوب ہے؟ اور کیوں مطلوب ہے؟

یہ کتاب دراصل اسی مطالبہ کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوشش کام یاب ہوئی ہو۔

صدرالدین

دوشنبہ، ۲ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ